لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔

نہ سورج چاند کو پکڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے اور ہر ایک چیز ایک چکر میں بڑی گردش کھا رہی ہے۔

جب مخلوقات کے دائرہ کی یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو خالق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ کوئی انسان اپنے دائرہ سے ترقی کرکے اس کی سرحد میں قدم رکھ سکتا ہے، سفیہانہ خوش عقیدگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے فلسفۂ ارتقاء (Evolution.) تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی مخلوقات کی کسی کڑی کا عالمِ قدس سے کوئی اتصال ثابت نہیں ہوتا اس لئے رسول کا تصور اسلام میں بلا کسی ادنیٰ شائبۂ تنقیص کے یہ ہے کہ وہ ایک انسانِ کامل ہوتا ہے اور اپنی تمام عظمتوں اور مراتبِ قرب کے باوجود الوہیت کے شائبہ سے یکسر بری ہوتا ہے۔

انسانیتِ رسول کا ایک کمال ہے

رسول ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں پر اس کی برتری سمجھنے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا پیغمبر ہے اس کی جانب سے منصبِ اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے اور اس لئے اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو کیونکہ اصلاح کے لئے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزدہ کی پوری تسلی بھی نہیں کر سکتا۔ جو بھوک سے آزاد ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دلسوزی کرنا بھی نہیں جانتا اور جو فطرتِ انسانی کی کمزوریوں سے آشنا نہیں وہ ان کمزوریوں پر اغماض بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے جا بجا بعثت کے ساتھ رسولوں کا انسان ہونا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ الخ یہاں امتنان و احسان کے موقع میں منجملہ اور باتوں کے تین امور کو بالخصوص نمایاں کیا گیا ہے۔ بعثتِ رسول اس انعام کے لئے سرزمینِ عرب کا انتخاب اور سب سے بڑھ کر اس رسول کا انسان ہونا۔

حضرت خلیلؑ نے جب بنی اسماعیل میں ایک نبی کے لئے دعاء فرمائی تو انھوں نے بھی اس اہم نقطہ کو فراموش نہیں کیا اور اپنی دعا میں فرمایا:۔

ربنا وابعث فیھم رسولا منھم — اے ہمارے رب ان میں رسول بھیج جو انھیں میں سے ہو

پھر جب اس دعاء مستجاب کے ظہور کا وقت آیا تو دعاء خلیل میں لفظ "منہم" کی استجابت کو مزید تاکید کے ساتھ لفظ "من انفسہم" سے ذکر کیا گیا ہے "لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم" یعنی اس رسول کو انسانوں میں تو بھیجا ہی تھا مگر ان میں بھی جن سے انھیں قریب سے قریب تر علاقہ ہو سکتا تھا ان میں بھیجا ہے، انسانوں میں عرب، عربوں میں قریشی اور قریشی میں ہاشمی بنایا مگر ان چند در چند خصوصیات کے باوجود پھر وہ ایک انسان ہی رہا۔ یہی وہ عقیدہ تھا جو ابتدا میں اولاد آدم کو بنیادی طور پر بتلا دیا گیا تھا۔

یا بنی اٰدم اما یاتینکم رسل منکم — اے اولاد آدم اگر تمہارے پاس تم ہی میں کے رسول
یقصون علیکم اٰیاتی فمن — آئیں کہ تمہارے سامنے ہماری آیات پڑھ پڑھ کر
اتقی واصلح فلا خوف علیھم — سنائیں تو جو تقوی کی راہ اختیار کرے اور نیک رہے
ولا ھم یحزنون۔ — تو ان پر نہ کوئی خوف و ہراس اور نہ کوئی غم۔

آیتِ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی ابتدا میں جن باتوں کی اولادِ آدم کو بنیادی طور پر تعلیم دی گئی تھی ان میں ایک بعثتِ رسول، دوم رسولوں کے انسان ہونے کا عقیدہ تھا۔ اسی وعدہ کے مطابق دنیا میں خدا کے بہت سے رسول آئے جن کی صحیح تعداد خدا ہی کو معلوم ہے مگر قرآن سے جس قدر اجمالاً معلوم ہو سکا ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے منصبِ نبوت کے لئے دو انسان منتخب ہوئے تھے۔ پھر افراد و اشخاص کی بجائے خاندانوں کا انتخاب کیا گیا، اس کے بعد جب خاندانوں نے انحراف اور کفرانِ نعمت شروع کیا تو بنی اسماعیل کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس درمیان میں دنیا کی مقررِ عمر آخر ہونے لگی، ادھر رسولوں کی مقرر تعداد بھی پوری ہو گئی، اس لئے آخری رسول کو بھیج کر اس سلسلہ کو ختم کر دیا گیا اور رباطِ عالم لپیٹنے کا اعلان کر دیا گیا

ان اللہ اصطفی اٰدم ونوحا و — اللہ تعالیٰ نے پسند کیا آدم کو اور نوح کو اور
اٰل ابراھیم واٰل عمران علی العلمین — خاندانِ ابراہیم اور خاندانِ عمران کو تمام جہان پر

ذریۃ بعضہا من بعض — جو ایک دوسرے کی اولاد ہیں۔

اس تمام سلسلہ میں جو حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتا ہے کوئی رسول ایسا نہ تھا جو انسان نہ ہوتا ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ نصاریٰ کی نظروں میں کچھ مشتبہ تھا اسی کو ذریۃ بعضہا من بعض کہکر صاف کر دیا گیا ہے یعنی جب وہ بھی انسانوں ہی کی اولاد تھے تو یقیناً ان کو بھی انسان ہونا چاہیئے۔

علاوہ اس کے کہ رسول اگر انسان نہ ہوں تو وہ انسانوں کی پوری اصلاح نہیں کر سکتے نسلِ انسانی پر یہ ایک بدنما داغ ہوتا کہ اشرف المخلوقات کا مصلح و مربی کسی اور نوع میں پیدا کیا جائے اس لئے خود رسول اور نوع انسانی کا شرف و کمال یہی تھا کہ رسول انسانوں میں سے ایک انسان ہو

لفظ رسول کی تشریح

رسول کا صحیح مقام سمجھنے کے لئے خود لفظِ رسول سے زیادہ صحیح اور آسان کوئی اور لفظ نہیں ہے۔ اس لفظ سے محبت و عظمت کے وہ تمام تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لئے فطرتِ انسانی میں موجزن ہوتے ہیں اور عبد و معبود کی وہ ساری حدود بھی محفوظ رہتی ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان خطِ فاصل ہیں۔ اسی لئے خدائے تعالیٰ کے سب رسولوں نے اپنا تعارف اسی لفظِ رسول کے ذریعہ پیش کیا ہے اور آخر میں قرآنِ کریم نے سب سے افضل اور سب سے برتر رسول کا تعارف بھی جس لفظ سے پیش کیا وہ یہی لفظ رسول ہے۔

(۱) محمد رسول اللہ ــــ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے پیغمبر ہیں۔

(۲) وما محمد الا رسول ــــ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر ہونے کے سوا الوہیت کا شائبہ تک نہیں رکھتے

معلوم ہوا کہ یہ کلمہ ایسا پر عظمت کلمہ ہے کہ نبی الانبیاء کے تعارف کے لئے بھی اس سے زیادہ موزوں کوئی اور کلمہ نہیں ہے۔ صوفیاء نے بڑے بڑے مجاہدات کے بعد یہاں کچھ خوشنما کلمات استعمال کئے ہیں۔ وجود کا نقطۂ اول۔ حقیقۃ الحقائق۔ برزخیۃ کبریٰ۔ مگر انصاف یہ ہے کہ ان سب کلمات کے تکرار سے کچھ غلط فہمیاں تو پیدا ہو گئیں لیکن آپ کا صحیح مقام پھر اتنا دریافت نہ ہو سکا جتنا کہ لفظِ رسول سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ ہر دور میں مشہور و معروف تھا، اس کے لوازم

سب کے ذہن نشین تھے، اس کے فرائض و خدمات سب کو معلوم تھے، اس کی شخصیت واحترام سے سب آشنا تھے اور یہ تو کسی ناسمجھ سے ناسمجھ انسان پر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان نوازش وکرم کے سوا، برابری اور مساوات کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، اس لئے جب کوئی رسول دنیا میں آتا تو یہی کہدیتا کہ میں احکم الحاکمین، ملک الملوک کا ایسا ہی ایک رسول ہوں جیسا کہ دنیا کے بادشاہوں کے رسول ہوا کرتے ہیں۔ بس اسی ایک نقطہ سے سامعین کے دلوں میں ساری عظمتیں دوڑنے لگتیں، محبت وتوقیر، اطاعت وحکمبرداری کے وہ تمام جذبات امنڈنے لگتے جو ایسے رسول کے لئے امنڈنا چاہئیں اور بیک وقت وہ تمام حدود بھی نظروں کے سامنے آجاتیں جو ایک بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان فاصل رہنا چاہئیں۔ اس لئے محبت واطاعت کے ان تمام جذبات کے ساتھ ان کا جوہر توحید بھی کفر وشرک کے گرد سے کبھی بے آب نہ ہوتا۔

رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے

درحقیقت یہ مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا کہ ایک طرف اسلام کی نازک توحید خدا ہی کی اطاعت اور اسی کی محبت کا مطالبہ کرتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنے سوا، رسول کی محبت واطاعت کا بھی حکم دیتی ہے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ نسبتِ رسالت کے بعد رسول کی ہستی درمیان میں صرف ایک واسطہ ہوتی ہے اس کی اطاعت ومحبت خدا ہی کی محبت واطاعت ہوجاتی ہے اسی لئے فرمایا

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ — جو رسول کا کہنا مانے اس نے خدا ہی کا کہنا مانا

یعنی اصل حکمبرداری تو خدا کی چاہئے۔ ظاہری سطح میں رسول کی اطاعت گو اس کے خلاف نظر آئے مگر حقیقت میں وہ خدا ہی کی حکمبرداری ہوتی ہے بلکہ اس کی اطاعت ومحبت کے بغیر، خدا کی محبت واطاعت کا کوئی اور راستہ ہی نہیں۔ اور اس طرح یہ اطاعت ومحبت کتنی ہی پھیلتی چلی جائے مگر اس کا اصل مرکز خدا ہی کی ذات پاک رہتی ہے۔

رسول ووکیل

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوگیا کہ رسول خدا نہیں، اس کا اوتار و بروز نہیں اور اس کا بیٹا بھی نہیں۔ اب یہ سنئے کہ وہ اس کا وکیل ومختار بھی نہیں۔ عربی میں دوسرے کی خدمت سرانجام

دینے کے لئے دو لفظ ہیں۔ (۱) رسول (۲) وکیل — ان دونوں کا تصرف دراصل دوسرے کے لئے ہوتا ہے اپنے لئے نہیں ہوتا، مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وکیل کا تصرف بہ نسبت رسول کے زیادہ وسیع اور زیادہ قوی ہے۔ وکیل اپنے موکل کی طرف سے مختار ہوتا ہے جو چاہے بطور خود بھی کر سکتا ہے۔ اسی لئے خصومت و جوابدہی کا بھی اس کو حق حاصل ہوتا ہے۔ رسول صرف اُس امانت کے پہنچا دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے۔

مثلاً اگر ایک بادشاہ کسی شخص کو اپنا وکیل و مختار بنا دے تو اس کو حق ہے کہ وہ موقعہ و محل کے لحاظ سے جو مناسب سمجھے گفتگو کرے بلکہ چاہے تو قوانین میں ترمیم و تنسیخ بھی کر ڈالے مگر ایک پیغامبر کو اس کے سوا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ جو پیغام اس کے ذریعہ بھیجا گیا ہے وہ بے کم و کاست اس کو پہنچا دے اس لحاظ سے وکیل کی حیثیت گو بلند ہے مگر بلحاظ ذمہ داری سخت بھی بہت ہے قرآن کریم نے بہت جگہ اس کا اعلان کیا ہے کہ جنھیں ہم بھیجیں گے وہ صرف ہمارے رسول ہوں گے نہ کہ وکیل۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خدا خود ہی سب کا وکیل بن گیا ہے تو اب اس کا وکیل کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی بڑے سے بڑے انسان میں اس کی طاقت نہیں کہ وہ اُس ذمہ داری کا بار اٹھا سکے جو خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔ پھر اس کی طرف سے وکالت کیسے متصور ہو سکتی ہے۔

اب آیاتِ ذیل کو پڑھئے:۔

اللہ خالق کلّ شئ وھو علیٰ کلّ شئ وکیل۔	اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی سب کا وکیل و کارساز ہے۔
وللہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض وکفیٰ باللہ وکیلا۔	آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے اور سب کے لئے خدا کی ذات کارساز کافی ہے۔"
الا تتخذوا من دونی وکیلا	"میرے سوا کسی اور کو اپنا وکیل و کارساز مت بناؤ"
قل لست علیکم بوکیل۔	"آپ کہدیجئے کہ میں تم پر وکیل بنا کر نہیں بھیجا گیا، رسول مقرر ہوا ہوں۔

من اهتدیٰ فانما یهتدی لنفسه ومن ضل فانما یضل علیها وما انا علیکم بوکیل۔ "جو راہ یاب ہوا اپنے فائدہ کے لئے اور جس نے گمراہی اختیار کی اپنا ہی نقصان کیا اور میں تو تم پر وکیل و مختار مقرر نہیں ہوا کہ جوابدہی میرے سر ہو۔"

بلغ ما انزل الیک من ربک۔ "جو آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا جاتا ہے وہ آپ پہنچا دیجئے۔"

ان علیک الا البلاغ۔ آپ کا ذمہ صرف پہنچا دینا ہے۔

أبلغکم رسالات ربی "میں اپنے پروردگار کے پیغامات تمہارے پاس پہنچائے دیتا ہوں۔

قل ما یکون لی ان ابدله من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی۔ آپ کہدیجئے کہ یہ میری طاقت نہیں ہے کہ میں قرآن کریم کو اپنی طرف سے بدل ڈالوں، میرے پاس تو جو حکم آئے اس کا تابعدار ہوں۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ رسول کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ احکام الٰہیہ پہنچا دے اور بس۔ شریعت کے ایک شعشہ اور ایک نقطہ بدلنے کا حق اس کو نہیں۔ کسی کی ہدایت و گمرہی کا بار اس پر نہیں اور نہ آخرت میں کسی کے اعمال کا وہ جواب دہ ہے جہاں تک کارخانۂ عالم کی ذمہ داری و کارسازی کا تعلق ہے اس کے ذرہ ذرہ کی کفالت و وکالت خدا تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے اور اس کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ اور رسولوں کی پوزیشن صاف کرنے کے لئے اپنی اور رسولوں کی زبانی یہ بات واضح کر دی ہے کہ ان کی حیثیت صرف رسالت کی حد تک ہے وکالت کی نہیں ہے تاکہ ہر انسان سوچ سمجھ لے کہ ہدایت و ضلالت کی جوابدہی اُسے خود براہ راست کرنی ہے، جسے رسولوں کی ذات پر ٹالا نہیں جا سکتا۔

وکالت تو بہت دور کی بات ہے اگر کہیں ہر شخص سے خدا تعالیٰ کا باتیں کرنا طور خالقیت کے خلاف نہ ہوتا تو شاید اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان رسالت کا واسطہ بھی نہ ہوتا۔ مگر جس طرح

دنیا میں بادشاہ اپنی رعایا سے بلا واسطہ کلام نہیں کیا کرتے ۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی اپنی ہر مخلوق سے براہِ راست کلام کرنا پسند نہیں فرمایا بلکہ اس کے لئے کچھ ہستیاں منتخب کرلی ہیں جو اس کی نظر میں اس کے لئے اہل بنائی گئی تھیں پھر اُن میں بھی یہ حوصلہ نہیں ہے کہ بے حجابانہ وہ جب چاہیں اُس سے باتیں کرلیں اس لئے ان کی برداشت کے بقدر اپنی ہمکلامی کی صورتیں مقرر کردی ہیں۔

وماکانَ لبشرانْ یکلمہُ اللہُ اِلّا	کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ اُس سے
وحیًا او من وّراءِ حجاب	باتیں کرسکے مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کوئی
او یرسل رسولا فیوحی باذنہ	فرشتہ بھیجے پھر وہ خدا کے حکم سے جو اُس کو منظور ہو
ما یشاء (الشوریٰ ـ ۶)	اس کا پیغام پہنچادے۔
وماکانَ اللہُ لیطلعکم علی	یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو براہِ راست
الغیب ولکنّ اللہ یجتبی من	غیب کی خبر دیدیا کرے لیکن اس کے لئے اللہ تعالیٰ
رسلہٖ من یشاء (آل عمران ـ ۹)	اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے چھانٹ لیتا ہے۔
عالم الغیب فلا یظہر علی	"وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنی غیب کی باتیں
غیبہٖ احدًا الا من ارتضی من	کسی پر ظاہر نہیں کیا کرتا مگر ہاں جس رسول کو چاہے
رسول۔	پسند کرلیتا ہے" (اور انھیں جو بات بتلانا چاہے بتلادیتا ہے)

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دستور نہیں رکھا کہ عام لوگوں کو بلا واسطہ غیب کی یقینی خبریں دیا کرے بلکہ اس کام کے لئے وہ رسولوں کا انتخاب کرتا ہے اور ان کے ذریعہ سے پھر تمام مخلوق سے ہمکلام ہوتا ہے اور یہ دستور اس لئے رکھا ہے کہ عام بشر تو درکنار رسول بھی اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ خدا تعالیٰ سے جس طرح چاہیں مشافہۃ کلام کرسکیں اس لئے اُن سے کلام کرنے کی بھی صرف چند صورتیں اختیار کی گئی ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ متکلم خود ذات پاک ہو مگر سامنے نہ ہو بلکہ پسِ پردہ ہو، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر کلام۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کرے اس کی

دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ نبی خود بشریت سے ملکیت کے قریب آجائے۔ دوم یہ کہ ملک یعنی فرشتہ بشریت کے قریب آجائے۔ ان دونوں صورتوں میں رسول سے بالواسطہ کلام ہوتا ہے۔ ان سب صورتوں میں چونکہ خدا تعالیٰ کی ذات پاک رسول کے سامنے نہیں ہوتی اس لئے کلام الٰہی کی شوکت و طاقت رسول کے لئے قابلِ برداشت ہوجاتی ہے اگر کہیں آمنے سامنے آکر کلام ہو تو بشریت کی ضعیف تعمیر برباد ہوجائے۔

رسول اور مصلح ریفارمر

جس طرح کہ رسول وکیل و مختار نہیں ہوتا اسی طرح وہ صرف ایک مصلح و ریفارمر بھی نہیں ہوتا۔ رسول اور ریفارمر میں بڑا فرق ہے۔ ایک ریفارمر اور مصلح کی پرورش عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے ان ہی کی طرح وہ تعلیم حاصل کرتا ہے پھر اپنی فطری صلاحیت و دلسوزی کی بنا پر قومی اصلاح کی خدمت انجام دیتا ہے جب اس کی فہم و فراست، ہمدردی اور نیک نیتی کے اثرات قوم میں نمایاں ہوتے ہیں تو قوم کی نظروں میں وہ خود بخود ایک مصلح و ریفارمر کا رتبہ حاصل کرلیتا ہے مگر رسولوں کی تربیت صفت اجتبا و اصطفا کے ماتحت ہوتی ہے، ان کی ہر نشست و برخاست ہر قول و فعل کی قدرت خود نگراں ہوتی ہے اور اسی حفاظت کی وجہ سے ان کو صفتِ عصمت حاصل ہوجاتی ہے ایک مناسب عمر پر وہ خود انھیں منصب اصلاح پر فائز کرتی ہے — ریفارمر عصمت کا مدعی نہیں ہوتا غلطی کا احتمال اس پر ہر وقت جائز ہے۔

رسول کی دو زندگیاں رسالت سے پہلی اور رسالت کے بعد اس قدر ممتاز ہوتی ہیں گویا بلحاظ ذمہ داری وہ دو انسان ہوتے ہیں۔ رسالت سے پہلے وہ عام انسانوں کی صف میں شامل ہوتا ہے نہ کوئی دعویٰ کرتا ہے نہ عام انسانوں کے عقائد و اعمال سے کوئی ذمہ دارانہ سروکار رکھتا ہے۔ اس کی دعوت میں کوئی تدریج، کوئی تمہید نہیں ہوتی، وہ خود بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ کل اُسے کیا کہنا ہے۔ وہ بالکل خاموش خاموش نظر آتا ہے اور جونہی کہ منصب رسالت پر فائز ہوجاتا ہے تو اس طرح بولتا ہے کہ کسی کا خوف و خطر اس کے آس پاس نہیں آتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احوال پر نظر ہے یا تو وہ فرعون کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر

بھاگ رہے تھے، یا رسالت کی دوسری ہی ساعت میں پھر اُسی کی طرف واپس جاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور وہ بھی کس کام کے لئے؟ اُس سرکش کو خدا کے عذاب سے ڈرانے کے لئے جس کے عذاب سے ڈر کر کل خود بھاگ رہے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے کہ یا عزلت نشینی تھی کہ غارِ حرا میں چالیس چالیس دن تک اس کی خبر بھی نہ رہتی تھی کہ دنیا کدھر جا رہی ہے یا اب کوئی بازار نہیں، کوئی مجمع نہیں، کوئی محفل نہیں، جہاں دنیا کی اصلاح و خبر گیری کے لئے آپ پہنچ نہ رہے ہوں، خلاصہ یہ کہ رسول کی زندگی کسب و اکتساب تکلف و تصنع کی تمام قیود سے آزاد ہوتی ہے وہ از خود نہ رسول بنتے ہیں نہ بن سکتے ہیں اور نہ خود قوم کسی کو رسول بنا سکتی ہے بلکہ یہ دستِ قدرت کا براہ راست انتخاب ہوتا ہے جسے چاہے اس منصب کے لئے انتخاب کر لیتا ہے۔

رسول ریاضت سے نہیں بنتے وہ پہلے سے منتخب شدہ ہوتے ہیں

رسالت ایک قسم کی سفارت ہے، ہر سفیر کے لئے قابل ہونا تو ضروری ہے مگر ہر قابل انسان کے لئے سفیر ہو جانا ضروری نہیں۔ یہ بادشاہ کی اپنی مصلحت اور صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ کس کو اس کا اہل سمجھتا ہے۔

خدا کی زمین پر دنیا کے جس قدر رسول آئے آپ سب کی سیرت بالتفصیل مطالعہ کر جائیے ان کی زندگیوں کا ورق ورق لوٹ جائیے مگر قرآن و حدیث سے کہیں ثابت نہیں ہوگا کہ کسی کو منصبِ رسالت کسی رسول کی اتباع و اطاعت کے صلہ میں ملا ہو۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ بوقت ضرورت براہِ راست ان کو اس منصب سے نواز دیا گیا ہے بلکہ رسول کا خود مفہوم بھی یہ بتلاتا ہے کہ یہ گروہ عام انسانوں اور خدا تعالیٰ کے درمیان پیغامبری کے لئے بنایا گیا ہے تاکہ ان کے واسطہ سے لوگ شریعت پر عمل اور خدا کی عبادت کرنا سیکھیں اس لئے نہیں کہ شریعت پر عمل کر کے یہ خود خدا کے رسول بن جائیں چنانچہ جب وہ آتے ہیں تو گمراہوں میں راہنما، جاہلوں میں عالم، مفسدوں میں مصلح اور کافروں میں اول مسلم بن کر آتے ہیں۔ رسالت سے پہلے بھی ان کا دامن شرک و کفر کی تمام نجاستوں سے پاک ہوتا ہے اور جو حرکات ادیانِ سماویہ میں ناقابلِ برداشت ہیں وہ نبوت و رسالت سے پہلے بھی

ان سے دور ہی دور رہتے ہیں اور اپنی اس بے لوث اور پاک وصاف زندگی کی وجہ سے قوم میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی ریاضت وعبادت اس لئے نہیں ہوتی کہ انھیں رسول بننا ہے بلکہ اس لئے ہوتی ہے کہ ان کی یہ پاک وصاف زندگی قوم کی نظروں میں نمایاں کی جائے اور اس لئے نمایاں کی جائے کہ جب وہ رسالت کا دعویٰ کریں تو خود ان کی یہی زندگی اس کی تصدیق کا بڑا سامان ہو جائے۔ اگر بالفرض رسالت کسب واکتساب کا ثمرہ ہوتی ہے تو رسولوں کی بعثت یا فترت کا مدار عبادت کی سرگرمی یا عبادت میں سرد مہری پر ہوتا۔ حالانکہ یہاں معاملہ برعکس ہے یعنی جتنی عبادت زیادہ ہوتی اسی قدر رسولوں کی آمد میں تاخیر ہوئی اور جتنی گمراہی وضلالت نے شدت اختیار کی اسی قدر رسولوں کی آمد کا زمانہ قریب تر ہو گیا۔ پھر جب خدا کا کوئی رسول آگیا اس کی زیر قیادت عبادت کر کے ایک بھی رسول نہیں بنا اور جب اس کی تعلیمات کے نقوش مٹنے لگے تو ایسے ایسے رسولوں کی آمد ہوئی جن کا پہلی شریعت سے کوئی تعلق بھی نہ تھا یا تعلق تھا تو اور نسخ کا تعلق تھا اس لئے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ رسول کسی عبادت وریاضت سے نہیں بنتے بلکہ خود بنے بنائے آتے ہیں۔ قرآن کریم کے لفظ "یاتینکم رسل منکم" میں بھی اسی طرف اشارہ نکلتا ہے یعنی اے بنی آدم تم میں کوئی فرد عبادت کر کے خود رسول نہیں بنے گا بلکہ رسول تمہارے پاس اس طرح آئے گا جیسا کہ حکومت کی جانب سے کوئی حکم مقرر ہو کر آیا کرتا ہے۔

ڈگریاں بڑی سے بڑی حاصل کی جاسکتی ہیں مگر حکومت کا کوئی عہدہ بلا انتخاب حکومت حاصل نہیں ہوتا ہاں لیاقت واستعداد کے بعد اس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ نظر حکومت اگر اُسے انتخاب کرنا چاہے تو کر لے۔ اسی طرح رسالت ونبوت کی کیفیت ہے یہ ایک منصب اور عہدہ ہے، نہ کہ انسان کے ممکن الحصول ارتقائی کمالات میں کوئی کمال، ہاں اس منصب کے متعلق کچھ کمالات ہیں جو اُس منصب پر موقوف ہیں۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے لوکان بعدی نبی لکان عمر یعنی میری امت میں اگر بلحاظ کمال دیکھا جائے تو عمر میں رسالت کی صلاحیت موجود ہے مگر چونکہ منصب نبوت پر تقرر کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی اس لئے نبی نہیں ہیں۔ اسی طرح فرمایا۔

لو عاش ابراھیم لکان صدیقا نبیا۔
ابراہیم (فرزند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اگر جیتے تو صدیق نبی ہوتے۔

یعنی ان کا جوہر استعداد بھی نہایت بیش قیمت تھا، انسانوں میں نبی بلکہ صدیق نبی بننے کے لائق تھے مگر یہاں ایک اور مانع بھی پیش آگیا تھا وہ یہ کہ ان کی عمر وفا نہ کر سکی امت میں ان دو شخصیتوں کے متعلق تو خود زبانِ نبوۃ سے تصریح آگئی کہ بلحاظ لیاقت و کمال یہ دونوں منصبِ نبوۃ کے قابل تھے جن میں سے حضرتِ ابراہیمؑ کی تو عمر ہی نے وفا نہ کی حضرت عمرؓ کی عمر ہوئی تو تقررِ نبوت کا زمانہ نہ رہا تھا۔ ان کے علاوہ خدا تعالیٰ ہی کو معلوم کہ اس امت میں اور کتنے انسان ایسے گذر گئے ہوں گے جو بلحاظ نفسی کمالات انبیاء سے کتنے مشابہ ہوں گے مگر عالمِ تقدیر میں چونکہ نبوت ہی کا ختم کر دینا ٹھہر چکا تھا اس لئے کوئی اس منصب پر نوازا نہیں گیا اور دنیا کی تاریخ جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے شور مچا مچا کر رسولوں کی آمد آمد پکار رہی تھی اب یہ کہکر خاموش ہوگئی کہ دنیا کا آخری راہنما آچکا اب اس کے بعد کوئی رسول نہیں ہے۔

بہرحال تمام رسولوں کی تاریخ سے ہمیں یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی ریاضت و عبادت کے صلہ میں رسول نہیں بنتے بلکہ عین لاعلمی کی حالت میں اچانک خدا کی طرف سے منصبِ رسالت پر مامور ہو جاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو منصبِ نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ ابھی حضرت ہارون علیہ السلام کی نبوت کا کوئی ذکر فکر بھی نہیں تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر میرے بھائی میرے شریک کار ہو جائیں تو شاید خدماتِ نبوت کی ادائیگی میں میرے لئے سہولت رہے لیکن منصبِ نبوت چونکہ براہِ راست خدا تعالیٰ کے اصطفاء پر موقوف ہے اس لئے ان کو اسی ایک بارگاہ میں یہ درخواست پیش کرنا پڑی:۔

واجعل لی وزیرا من اھلی
ھارون اخی اشدد بہ ازری
میرے بھائی کو میرے گھرانے سے میرا وزیر بنادے
اور ان کے ذریعہ میری کمر مضبوط کر اور میرا انیس

واشرکہ فی امری ۔ شریک کار بنادے ۔

اگر نبوت اکتسابی ہوتی تو یہاں سفارش کے موقعہ پر اُن کے ایسے اوصاف کا ذکر کرنا مناسب ہوتا جو نبوت کا سبب بن سکتے ہیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہاں جن اسباب کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں :-

واخی ھارون افصح لسانا منی میرا بھائی مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے اُسی میری

فاجعلہ معی ردءا یصدقنی انی مدد کے لئے میرے ساتھ کردے وہ میری تصدیق کریگا

اخاف ان یکذبون ۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں وہ میری تکذیب نہ کریں ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست کو منظور کرلیا گیا اور ان کو بھی نبی بنا دیا گیا ۔ سوچئے کہ فصاحت وبیان کو نبوت میں کیا دخل ہے ۔ اس کے برخلاف جب کوہِ طور جاتے ہوئے انھیں ایک خلیفہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہاں کوئی درخواست بارگاہِ رب العزت میں پیش نہیں فرمائی اور براہِ راست خود فرمادیا ۔ واخلفنی فی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین ۔

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ خلافت ونبوت میں کتنا فرق ہے خلیفہ نبی خود بھی بنا سکتا ہے مگر نبی کسی کو نہیں بنا سکتا ہاں اس کے لئے دعا کرسکتا ہے چونکہ حضرت علیؓ کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی نسبت حاصل تھی اس لئے گمان ہوسکتا تھا کہ جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے حق میں نبوت کی دعا کی اور قبول ہوگئی اسی طرح اگر آپ بھی ان کے لئے دعا فرمائیں تو قبول ہوجائے اسی بنا پر جیسا کہ علمائے حدیث کو معلوم ہے اس سے قبل کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں یہ خیال گذرے اور آپ کے دستِ مبارک دعا کے لئے اٹھ جائیں آپ سے کہدیا گیا کہ تم اپنے داماد علیؓ کے لئے جو دعا چاہو مانگ لو مگر ایک نبوت کی دعا مت کرنا ۔ کیونکہ عالم تقدیر میں یہ طے ہوچکا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور جو بات یہاں طے ہوجاتی ہے وہ پلٹا نہیں کرتی ۔

یہی صورت شبِ معراج میں پیش آئی ہے جب تقدیر کو یہ منظور ہوا کہ اب آئندہ سلسلہ تخفیف ختم کیا جائے اور پانچ نمازیں امت کے لئے ایک واجب العمل دستور ہوجائے تو پہلے ہی آپ سے کہدیا گیا لا یبدل القول لدی تاکہ بعد میں لا یبدل القول کا آئین آپ کے استجابتِ دعا میں حائل نہ ہو ۔ یہی وجہ ہے

کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اصرار کے باوجود آپ پھر سفارش کے لئے تشریف نہیں لے گئے۔

خلاصہ یہ کہ نبوت نہ پہلی امتوں میں کسب کا نتیجہ تھی نہ اب ہے ہاں پہلے منصب نبوت باقی تھا اس لئے دعا و سفارش کا موقعہ بھی تھا اب چونکہ منصب نبوت ہی نہیں رہا اس لئے نبوت کی دعا بھی نہیں کی جاسکتی ہاں اس کے بجائے خلافت باقی ہے اور وہ تا قیامت جاری رہے گی۔

پھر رسول جس طرح کہ خود بنتے نہیں اسی طرح خود بولتے بھی نہیں وہ خدا تعالیٰ کے ترجمان ہوتے ہیں جو اُن کو حکم ہوتا ہے وہی بولتے ہیں اور اسی لئے ان کا ہر حکم واجب التعمیل مفترض الطاعۃ ہوتا ہے۔ ہر امر میں ان کو حَکَم و فیصل بنانا، ان کے ہر فیصلہ پر راضی ہوجانا اور اس طرح راضی ہوجانا کہ اس میں تنگ دلی بھی محسوس نہ ہو، مومن کا اولین فرض ہوتا ہے۔ ریفارمر میں یہ خصوصیات نہیں ہوتیں وہ اپنے قومی خدمات کے صلہ میں ریفارمر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا حکم صرف اخلاقی حد تک واجب العمل ہوتا ہے اس کے ساتھ نزاع کا ہر وقت حق حاصل ہوتا ہے، اس کو خدائی ترجمانی کا کوئی دعویٰ نہیں ہوتا، اس کا تعلق ہماری زندگی کے صرف ایک شعبہ کے ساتھ ہوتا ہے یعنی معاش جسمانی مبدأ و معاد سے اسے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ رسول کا تعلق ہمارے ہر گوشۂ حیات سے ہوتا ہے، ریفارمر کا کوئی حکم مذہب نہیں کہلاتا۔ رسول کا ہر حکم مذہب کی بنیاد بن جاتا ہے۔ کسی قوم کا ریفارمر و مصلح بننے کے لئے اس کا ہمزبان ہونا شرط نہیں ہے۔ رسول کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس قوم کا رسول ہو اس کا ہمزبان بھی ہو۔ وما ارسلنا من قبلك من رسول الا بلسان قومه۔

رسول کا ہر علم قطعی ہوتا ہے شک و تردد کا اس میں کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ ریفارمر کی ہر ہدایت زیر احتمال رہ سکتی ہے اسی لئے رسول فلاح و کامیابی کا ضامن ہوتا ہے ریفارمر کامیابی کی ضمانت نہیں لے سکتا۔

رسول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وحدتِ ملی کا ایک مستحکم مرکز ہوتا ہے اسی لئے اس کی ذات ایمان و کفر کا محور ہوتی ہے یعنی اس سے وابستگی ایمان اور اس سے علیحدگی کفر کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ ہزاروں اختلافات رسول کی ذات سے وابستگی کے بعد وحدت و اخوت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور بہت سی جمعیتیں رسول کے دامن سے علیحدہ ہو کر صفت وحدت سے خالی ہو جاتی ہیں اسی لئے

تو یہ مغالطے پیش نہ آتے اور واضح ہو جاتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اتنا بعید نہیں ہوتا جیسا کہ عام انسان، اور اتنا قریب بھی نہیں ہوتا جیسا کہ اوتار و ابن۔ وہ بعید ہو کر اللہ تعالیٰ سے انتہائی قریب ہوتا ہے اور انتہا درجہ قرب کے باوجود پھر احد و صمد سے حلول و اتحاد کا کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ اس کا نام قرب ولایت نہیں یہ قربِ رسالت ہے۔ یہ انسان کے لئے مدارجِ قرب کی وہ آخری منزل ہے جس کے بعد کوئی منزل نہیں اگر ان دونوں میں فرق سمجھ لیا جاتا تو ایک محب کی زبان سے جو کبھی اضطراب میں عاشقانہ کلمات نکل جاتے ہیں نہ نکلتے اور وہ اپنی تمام لن ترانیوں کی بجائے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا [1]

زلاف حمد و نعت اولی است بر خاکِ ادب خفتن
سجودے می تواں کردن درودے می تواں گفتن

اسی لئے آسمانی مذاہب نے رسول کی اس درمیانی ہستی کے لئے جو جامع سے جامع لفظ اختیار کیا تھا وہ خود لفظِ رسول تھا اور اسی لئے اذانوں میں خطبوں میں نمازوں میں جس لفظ کا بار بار اعلان کیا جاتا ہے وہ یہی لفظِ رسول ہے۔ آج دنیا رسول کی معرفت کے لئے خود لفظِ رسول ناکافی سمجھتی ہے اور اپنی طفل تسلی کے لئے دوسرے عنوانات تراش تراش کر اپنے ذہن میں رسول کی حیثیت قائم کرنا چاہتی ہے۔ یاد رکھو کہ یہ کبھی نہیں ہوگا۔ رسول کی معرفت تم کو لفظِ رسول سے زیادہ صحیح کسی اور لفظ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔